آخری قسط

ابوالائمہ کے تعلیمات

آیۃ اللہ العظمیٰ سید العلماء مولانا سید علی نقی نقوی طاب ثراہ

عملی مخالفت نہ کرنے کے وجوہ

حضرت علیؑ نے متعدد مقامات پر وہ اسباب بھی ظاہر کئے ہیں جن کی بناء پر آپ نے خلفاء سے عملی طور پر مقابلہ نہیں کیا اور جنگ کی صورت نہیں آنے دی۔ ان میں سے بعض اسباب ظاہری ہیں اور بعض واقعی جو محل اور موقع کی مناسبت سے آپ نے بیان فرمائے ہیں۔

پہلا سبب

اور حقیقۃً یہی سب سے بڑا تھا جو امیر المومنینؑ کے لئے تلوار اٹھانے سے مانع تھا۔

وہ مفاد اسلامی کا خیال کہ موجودہ حالت میں جبکہ مسلمان ابھی پورے طور پر اسلام میں راسخ نہیں ہوئے ہیں اور بہت سے لوگ مرتد ہونے کے لئے تیار ہیں اگر کوئی ہنگامہ برپا ہوجائے اور مسلمانوں میں جنگ قائم ہوجائے تو اسلام کو بہت بڑا نقصان پہونچے گا اور یہ ظاہری اسلام کی شان بھی جو دنیا میں قائم ہے رخصت ہوجائے گی۔ اس مقصد کے لئے آپ نے نہ صرف جنگ سے پہلو تہی کی بلکہ اکثر مذہبی خدمتوں کے لئے دست تعاون بھی بڑھایا اور بوقت ضرورت حکومت وقت کی امداد بھی کی۔

اس کو آپ حسب ذیل میں ظاہر فرمایا ہے۔

ج۲ ص ۱۲۳ فَمَا رَاعَنِي إِلَّا انْثِيَالُ النَّاسِ عَلَى فُلَانٍ يُبَايِعُونَهُ فَأَمْسَكْتُ يَدِي حَتَّى رَأَيْتُ رَاجِعَةَ النَّاسِ قَدْ رَجَعَتْ عَنِ الْإِسْلَامِ يَدْعُونَ إِلَى مَحْقِ دِينِ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَآلِهِ فَخَشِيتُ إِنْ لَمْ أَنْصُرِ الْإِسْلَامَ وَأَهْلَهُ أَنْ أَرَى فِيهِ ثَلْمًا أَوْ هَدْمًا تَكُونُ الْمُصِيبَةُ بِهِ عَلَيَّ أَعْظَمَ مِنْ فَوْتِ وَلَايَتِكُمُ الَّتِي إِنَّمَا هِيَ مَتَاعُ أَيَّامٍ قَلَائِلَ يَزُولُ مِنْهَا مَا كَانَ كَمَا يَزُولُ السَّرَابُ أَوْ كَمَا يَتَقَشَّعُ السَّحَابُ فَنَهَضْتُ فِي تِلْكَ الْأَحْدَاثِ حَتَّى زَاحَ الْبَاطِلُ وَزَهَقَ وَاطْمَأَنَّ الدِّينُ وَتَنَهْنَهَ۔

"ایک مرتبہ نظر آیا مجھے یہ کہ لوگ فلاں شخص (ابوبکر) پر بیعت کے لئے ٹوٹ رہے ہیں۔ یہ دیکھ کر میں نے اپنا ہاتھ روک لیا یہاں تک کہ میں نے دیکھا کہ بہت سے لوگ دین اسلام سے پلٹ گئے ہیں اور اس دین کے مٹا دینے کی طرف دعوت دے رہے ہیں۔ اس وقت مجھے اندیشہ پیدا ہوا کہ اگر میں اسلام اور مسلمانوں کی نصرت نہ کروں تو مجھے دین اسلام میں رخنہ یا بربادی کا منظر دکھائی دے جس کی مصیبت میرے اوپر زیادہ سخت ہوگی تمہاری اس حکومت کے ہاتھ سے نکل جانے سے جو چند دنوں کی ایک بات ہے اور پھر اس طرح ختم ہوجانے والی ہے جس طرح شراب کا تخیل ختم ہوجاتا ہے یا ابر چھٹ جاتا ہے پس میں اٹھ کھڑا ہوا ان حوادث میں یہاں تک کہ باطل کا زور وشور ختم ہوا اور وہ فنا ہوا اور دین کو قرار حاصل ہوا اور سکون پیدا ہوا۔"

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ امیر المومنینؑ کے سامنے دو سوال تھے ایک مفاد اسلامی اور ایک اپنے حق کا حاصل کرنا۔ آپ نے مفادِ اسلامی کی خاطر اپنے حق کے حاصل کرنے میں عملی جدوجہد نہیں کی اور شمشیر زنی اور لشکر آرائی سے کام نہیں لیا۔

دوسرا سبب

یہ ظاہری پہلو جسے آپ سطحی نگاہ رکھنے والوں کے سامنے

بیان فرمادیا کرتے تھے، وہ انصار واعوان کی عدم موجودگی ہے۔ یہ عام لوگوں کی افتادطبع ہے کہ اگرانہیں کامیابی حاصل کرنے کے اسباب نہیں ہیں تب بھی وہ فریق مخالف کو پریشان کرنے کے لئے اور چین سے نہ بیٹھنے دینے کے لئے کچھ نہ کچھ دراندازی کرتے رہتے ہیں۔ امیرالمومنینؑ کی بلند ہستی اس کو پسند کرتی تھی۔ آپ نے عباس اور ابوسفیان سے اس وقت جب انھوں نے کہا ہے کہ ہم آپ کی خلافت کے لئے بیعت کئے لیتے ہیں جو کچھ ارشاد فرمایا ہے اس میں یہ بھی ہے کہ اَفْلَحَ مَنْ نَهَضَ بِجَنَاحٍ اَوِاسْتَسْلَمَ فَاَرَاحَ۔ (ج ا، ص ۴۵)

(یعنی) انسان اٹھے تو بال و پر کے ساتھ اٹھے اور نہیں تو پھر خاموش رہے اور دنیا کو چین سے بیٹھنے دے۔''

یہ طریقہ کہ کامیاب تو نہیں ہوں گے لیکن فضا میں بے چینی پیدا کئے رہیں گے اور فریق مقابل کو چین سے بھی بیٹھنے نہیں دیں گے۔ بالکل عقل وتدبر کے خلاف ہے۔

خطبہ شقشقیہ میں بھی آپ نے اسی کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔

ص ۳۵۔ وَطَفِقْتُ اَرْتَئِيْ بَيْنَ اَنْ اَصُوْلَ بِيَدٍ جَذَّاءَ اَوْ اَصْبِرَ عَلٰى طَخْيَةٍ عَمْيَاءَ يَهْرَمُ فِيْهَا الْكَبِيْرُ وَيَشِيْبُ فِيْهَا الصَّغِيْرُ وَيَكْدَحُ فِيْهَا مُؤْمِنٌ حَتّٰى يَلْقٰى رَبَّهٗ فَرَاَيْتُ اَنَّ الصَّبْرَ عَلٰى هَاتَا اَحْجٰى۔

''میں نے غور کیا کہ میں اس کٹے ہوئے دست وبازو کے ساتھ (یعنی بغیر انصار واعوان کے) حملہ کردوں یا اس گھنگھور مصیبت کی گھٹا پر صبر کروں جس میں کبیر السن آدمی بالکل پھوس بن جاتا ہے اور کمسن آدمی بھی بوڑھا ہوجاتا ہے اور مومن اس میں مبتلائے مصیبت رہتا ہے یہاں تک کہ اس دنیا کو خیر باد کہے۔ میں نے دیکھا کہ صبر کرنا اس مصیبت پر زیادہ مطابق عقل ہے۔

صفحہ ۴۷ میں ہے۔

فَنَظَرْتُ فَاِذَا لَيْسَ لِيْ مُعِيْنٌ اِلَّا اَهْلُ بَيْتِيْ فَضَنِنْتُ بِهِمْ عَنِ الْمَوْتِ وَاَغْضَيْتُ عَلَى الْقَذٰى وَشَرِبْتُ عَلَى الشَّجٰى وَصَبَرْتُ عَلٰى اَخْذِ الْكَظَمِ وَعَلٰى اَمَرَّ مِنْ طَعْمِ الْعَلْقَمِ۔

''میں نے نظر ڈالی تو دیکھا کہ میرا مددگار نہیں ہے سوائے میرے گھرانے والوں کے۔ میں نے ان کو موت کے منہ میں دینے سے بخل کیا اور چشم پوشی کی باوجود اس خاشاک کے جو آنکھ میں پڑا ہوا تھا اور پانی پیا باوجود اس ہڈی کے جو گلے میں پھنسی تھی اور تحمل کیا گلا گھٹنے پر اور تلخ ترین صورت حال پر۔''

یہ کہنا کہ بعقیدۂ شیعہ امیرالمؤمنین کو اعجاز کی طاقت تھی اور اس لئے تنہا مقابلہ کرسکتے تھے درست نہیں ہے اس بناء پر کہ شریعت اسلام کے احکام کی بنیاد ظاہری اسباب پر ہے ورنہ رسولؐ اللہ کو ہجرت کی ضرورت نہ ہوتی اور انصار کی امداد حاصل کرنے کی حاجت نہ ہوتی۔

تیسرا سبب

رسولؐ اللہ کی وصیت، یعنی حضرتؐ نے امیرالمومنینؑ کو آئندہ کے واقعات سے اطلاع دیتے ہوئے۔ یہ ہدایت کردی تھی کہ جنگ اور مقابلہ کی صورت پیدا نہ ہو، اسے آپ نے ایک موقع پر اس طرح بیان فرمایا ہے۔

ج ۱ صفحہ ۹۸، اَتَرَانِيْ اَكْذِبُ عَلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَاٰلِهٖ وَسَلَّمَ وَاللّٰهِ لَاَنَا اَوَّلُ مِنْ صَدَّقَهٗ فَلَا اَكُوْنُ اَوَّلَ مَنْ كَذَبَ عَلَيْهِ فَنَظَرْتُ فِيْ اَمْرِيْ فَاِذَا طَاعَتِيْ قَدْ سَبَقَتْ بَيْعَتِيْ وَاِذَ الْمِيْثَاقُ فِيْ عُنُقِيْ لِغَيْرِيْ۔

''کیا تم سمجھتے ہو کہ میں رسول اللہ کی جانب کوئی بات غلط طور پر منسوب کروں گا۔ بخدا میں نے سب سے پہلے حضرت کی تصدیق کی ہے تو میں پہلا شخص نہیں ہوں گا جو آپ کی طرف غلط نسبتیں دے۔ میں نے اپنے معاملہ میں غور کیا تو اطاعت رسولؐ میری بیعت سے پہلے موجود ہے اور عہد وپیمان کا حلقہ میرے گلے میں ایک دوسرے شخص (رسولؐ) کی جانب سے پڑا ہوا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ میرے بیعت نہ کرنے کا نتیجہ یہ نہیں تھا کہ میں مقابلہ کروں کیونکہ بیعت میں کروں یا نہ کروں اس کے

پہلے تو رسولؐ اللہ کی وصیت مجھ کو ہو چکی ہے اور مجھ پر اس کی پابندی لازم ہے۔

در حقیقت یہ تینوں باتیں جو درج ہوئیں باہم دست وگریبان ہیں اور ان میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ اگر امیر المومنینؑ کے انصار واعوان آپ کی حقیقت کے بارے میں عرب میں زیادہ تعداد میں موجود ہوتے اور آپ کی مخالف ایک بہت کمزور اور کم تعداد جماعت ہوتی تو آپ کے بزور شمشیر مسند خلافت پر متمکن ہونے سے اسلام کو کوئی خاص نقصان بھی نہ پہونچتا اور اس صورت میں رسولؐ اللہ کی طرف سے یہ وصیت بھی نہ ہوتی کہ مقابلہ نہ کیا جائے۔ لیکن چونکہ آپ کے خلاف ایک عام سازش کی جا چکی تھی اور بہت بڑی تعداد اشخاص کی آپ کے خلاف متحد بنالی گئی تھی اس لئے اگر آپ تلوار کھینچتے تو اسلام کی ظاہری صورت کو بہت بڑا نقصان پہونچتا اور اسی لئے رسول اللہ نے بھی یہ وصیت کی اور امیر المومنینؑ نے بھی اس کا لحاظ کیا۔

کم علم لوگ جذبات کے ماتحت کام کرتے ہیں لیکن امیر المومنینؑ ان تمام اسرار و باطنی سازشوں سے مطلع تھے جو آپ کے خلاف کی جا چکی تھیں۔ اس لئے آپ کبھی ایسے بے سمجھے بوجھے ہوئے اقدام پر تیار نہ ہو سکتے تھے۔

یہی آپ نے عباس اور ابوسفیان سے ارشاد فرمایا تھا کہ:۔

ج ۱ ص ۴۶ بَلِ انْدَمَجْتُ عَلٰى مَكْنُونِ عِلْمٍ لَوْبُحْتُ بِهٖ لَاضْطَرَبْتُمُ اضْطِرَابَ الْاَرْشِيَةِ فِى الطَّوِىِّ الْبَعِيْدَةِ

''مجھ کو وہ مخفی علم حاصل ہے کہ اگر میں اس کا اظہار کر دوں تو تم لوگ مضطرب ہو جاؤ اس طرح جیسے رسیاں مضطرب ہوتی ہیں بڑے گہرے کنووں کے اندر۔''

اس کے یہ معنی قرار دینا کہ آپ خلفائے وقت کی حقیقت کو جانتے تھے اور یہ کہ وہ مجھ سے زیادہ اس منصب کے اہل ہیں بالکل غلط ہے جبکہ آپ نے صاف صاف یہ تصریحات فرما دیئے ہیں کہ وہ لوگ خلافت کے مستحق نہیں ہیں اور اس منصب کا استحقاق صرف آپ کی ذات کو حاصل ہے اور کسی کو نہیں ہے۔

وصیت کے مسئلہ پر یہ اعتراض کہ پھر آپ نے جمل اور صفین اور نہروان میں کیوں تلوار اٹھائی ہرگز صحیح نہیں ہے۔ وصیت جس موقع سے متعلق تھی وہ دوسرا تھا اور تلوار جس موقع پر اٹھائی وہ دوسرا۔

عجیب کاروائی

وہ لوگ جنہیں کسی وجہ سے اس کی ضرورت ہے کہ حضرت علیؑ کو خلفاء ثلاثہ کے ساتھ متفق ثابت کریں ان کی جانب سے عجیب طرح کی کاروائیاں کی جاتی ہیں۔ کبھی تو اہلسنت کی کتابوں سے ایسی روایتیں درج کی جاتی ہیں جنھیں خاص اس مقصد کے لئے تصنیف کیا گیا ہے اور جن کو شیعہ کبھی تسلیم نہیں کر سکتے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ اس بات کے ظاہر کرنے کے لئے ہے کہ ہمارے دلائل محض الزامی نہیں۔ بلکہ تحقیقی ہیں۔ حالانکہ یہ اصول تحقیق کے بھی بالکل خلاف ہے۔ ایک اختلافی مسئلہ میں جتنا وزن مخالف اشخاص کے بیانات کو ہو سکتا ہے اتنا موافق افراد کے بیانات کو کبھی نہیں ہو سکتا۔ جبکہ تاریخ بتلاتی بھی ہے کہ اموی سلطنت کے عہد جبروت میں ہزاروں روایتیں اس طرح کی بن گئیں جن کی کوئی اصلیت نہیں ہے۔ ان افراد کے بحث کا یہ وہ کمزور پہلو ہے جس کا احساس اکثر غیر جانبدار محققین کو بھی ہوا ہے چنانچہ مسئلہ خلافت وامامت میں رسالہ ''نگار'' میں جو مضامین ہر نام اور خود نیاز فتحپوری کے شائع ہوئے ہیں ان میں اس کمزوری پر اعتراض موجود ہے۔

اس کے بعد جب نوبت آتی ہے شیعی کتب سے ثبوت پیش کرنے کی تو صحرائے استدلال بے آب وگیاہ نظر آتا ہے۔ اس وقت کانٹ چھانٹ کی ضرورت محسوس ہوتی ہے اور اس طرح اپنی پیاس کو بجھایا جاتا ہے۔

کبھی تو امیر المومنینؑ کے ان بیانات کو جو خلافت بمعنی سلطنت وحکومت سے متعلق ہیں لاکر چسپاں کیا جاتا ہے اس امامت پر جو جانشینی رسول کا حقیقی منصب ہے، اور جناب امیرؑ کے ان بیانات سے بالکل چشم پوشی کر لی جاتی ہے جو اس امامت کے متعلق صاف موجود ہیں نیز ان بیانات سے جن میں پہلی قسم

کی خلافت کو بھی اپنا حق بتلایا گیا ہے۔

یہ وہ چیزیں ہیں جو توضیح سے اس کے پہلے آچکی ہیں۔

اور کبھی الفاظ میں تحریف کی جاتی ہے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں حضرت علیؑ کا ایک خط پیش کیا جاتا ہے جو نہج البلاغہ میں مذکور نہیں ہے بلکہ بعض شارحین نہج البلاغہ نے شرح میں درج کیا ہے۔اس سے یہ عبارت نقل کی جاتی ہے کہ:۔

وکان افضلهم فی الاسلام وانصحهم لله ورسوله الخلیفة الصدیق وخلیفة الخلیفة الفاروق ولعمری انّ مکانهما فی الاسلام لعظیم وانّ المصاب بهما لجرح فی الاسلام شدید یرحمهاالله وجزاهمابا حسن ماعملا۔

''سب سے افضل اسلام میں اور سب سے زیادہ خیر خواہ خدا اور رسولؐ کے خلیفۂ رسول صدیق اور ان کے خلیفہ فاروق تھے اور قسم اپنی جان کی کہ جگہ ان کی اسلام میں بہت بڑی تھی اور مصیبت ان دونوں کے سبب سے اسلام میں شدید تھی خدا اپنی رحمت ان کے شامل حال کرے اور ان کو بدلا دے ان کے بہترین عمل کا۔''

اس عبارت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ واقعی امیر المومنینؑ ان دونوں بزرگواروں کی تعریف کررہے ہیں۔لیکن آپ کو یہ معلوم ہونے سے تعجب ہوگا کہ اس میں شروع کے جملہ میں ایک لفظ موجود تھی جس کو حذف کرکے اس تعریف کی عمارت بلند کیا ہے۔ پہلا فقرہ اس عبارت کا اصل میں یوں ہے:۔

وکان افضلهم فی الاسلام وانصحهم لله ورسوله کمازعمت الخلیفة الصدیق الخ۔

(یعنی) سب سے افضل اسلام میں اور خیر خواہ خدا اور رسول کے جیسا کہ تمہارا خیال ہے خلیفۂ صدیق تھے الخ۔

اب آپ نے دیکھا کہ یہ مخاطب کا خیال ذکر کیا جارہا ہے نہ اپنا عقیدہ پھر اس کے لئے زعم کی لفظ صرف کی گئی ہے جس کے لئے ارباب لغت سے یہ بھی سن لیجئے کہ ''عرب کی عادت ہے کہ جب کوئی شخص کچھ کہتا ہے اور وہ ان کے نزدیک غلط ہوتا ہے تو وہ کہتے ہیں ''زعم فلان'' یعنی یہ گمان باطل اس نے قائم کیا ہے۔''

(منجد ص۳۰۶)

کیا اس طرح کے تحریف سے جو نتیجہ نکالا جائے اس میں کوئی شائبہ حقانیت کا ہوسکتا ہے۔

وَوَلِيَهُمْ وَالٍ فَأَقَامَ وَاسْتَقَامَ حَتّىٰ ضَرَبَ الدِّينُ بِجِرَانِهِ۔

''خلق خدا کے اصلاح و انتظام کا ذمہ دار ہوا ایک حاکم و فرمانروا جو راہ راست پر قائم رہا اور دنیا کو اس نے سیدھے راستے پر لگایا یہاں تک کہ دین خدا نے اپنا سینہ زمین پر ٹیک دیا۔''

اس کی شرح میں مفتی دیار مصر یہ علامہ محمد عبدہ تو یہ لکھتے ہیں کہ **" الوالی یرید به النبی صلی الله علیه وسلم وولیهم ای تولّی امورهم وسیاسة الشریعة فیهم۔**

(یعنی) ''والی'' سے مراد حضرت رسول اللہؐ ہیں اور والی ہونے کے معنی یہ ہیں کہ آپ مسلمانوں کے اصلاح و تربیت اور شرعی سیاست کے ذمہ دار تھے۔''

انھوں نے اس خیال کو کہ اس سے حضرت عمر مراد ہیں انتہائی کمزور طریقہ سے ''قال قائل'' کے لفظ سے نقل کیا ہے۔ یعنی ایک کہنے والے نے یہ کہا ہے۔''مگر یہاں کے لوگ ہیں کہ وہ اس کمزور قول کو وحی آسمانی بنانے کے خواہشمند ہیں۔

فارس اور روم کے غزوات کے سلسلہ میں امیرالمؤمنین کے مشورے

یہ چیز ہے جس پر بڑا زور دیا جاتا ہے کہ امیر المومنینؑ کو خلفاء ثلاثہ اور بالخصوص حضرت عمر کے ساتھ اتنا اتحاد تھا کہ آپ نے ان کو بہت مفید مشورے دیئے ہیں۔

اس کے متعلق عرصہ ہوا کہ اخبار ''الواعظ'' لکھنؤ میں میرا ایک مضمون شائع ہوا تھا جو ''اتحاد الفریقین'' حصہ دوم میں امامیہ مشن کی جانب سے شائع ہوا ہے۔ چونکہ اس مضمون کو اس کتاب کے موضوع سے تعلق ہے اور یہی اس کا موقع ہے۔اس لئے اس

مضمون کو یہاں درج کیا جاتا ہے۔آئندہ اڈیشن اتحاد الفریقین سے اس کو نکال دیا جائے گا۔

سیرت علوی کا ایک ورق

دنیا میں ایسے افراد کی کمی نہیں جو ذاتی مفاد کے مقابلہ میں مذہبی و ملی مفاد کو پامال کر دیں لیکن ایسے افراد بہت کم ہیں جو اجتماعی مفاد کی خاطر اپنی شخصی و ذاتی مقاصد و اغراض پر پانی پھرنا گوارا کریں۔

انسان کی عام ذہنیت اس کو اغراض شخصیہ کی چار دیواری میں محدود رکھتی ہے اور اس کی افتاد طبع یہ ہے کہ وہ اپنے ذاتی مفاد کے مقابلہ میں دنیا کی کسی چیز کی طرف نظر اٹھا کر دیکھنے کی ضرورت محسوس نہ کرے اور پھر تنگ نظری یہ ہے کہ وہ دوسرے انسان کو بھی اپنے ہی اوپر قیاس کر کے اس کے طرز عمل کو اپنے زاویۂ نظر اور معیار ذہنیت سے جانچنے کی کوشش کرتا ہے۔

اس طرح نتائج نکالنے میں وہ ٹھوکریں کھاتا ہے اور غلطیاں کرتا ہے جس کی ذمہ دار اس کی پست ذہنیت ہے اور کچھ نہیں۔

حالانکہ عقل و تدبر کا اقتضا یہ ہے کہ بلند افراد کے طرز عمل کو ان کی شایان شان بلند ذہنیت کے مطابق اور پست افراد کے طرز عمل کو ان کے مطابق نقطۂ نظر سے جانچا جائے لیکن عام طور سے ایسا نہیں ہوتا۔

انسان کی بلند ترین صفت یہ ہے کہ جب مفاد شخصی اور مفاد نوعی واجتماعی میں تصادم ہو تو مفاد نوعی کو مقدم رکھا جائے۔انسان کی بلند صفت یہ ہے کہ وہ فرض شناسی کو ہر مقام پر مقدم رکھے اگرچہ وہ اس کے کسی نفسانی جذبہ کے خلاف ہو۔

انسان کی بلند صفت یہ ہے کہ وہ امانت و دیانت کو ہر موقع پر ملحوظ رکھے چاہے وہ اپنے دشمن کے ساتھ ہو۔

ہر امر میں ذاتیات کا مدنظر ہونا اور اپنی نفسانی محبت یا عداوت کو ہر بات میں دخل دینا یہ تو پست فطرت اور پست طبیعت افراد کا کام ہے جن میں حیوانیت کا عنصر انسانیت سے زیادہ کارفرما ہوتا ہے اگرچہ انسان کی اکثریت ہمیشہ اسی مسلک پر قدمزن ہے لیکن اکثریت کو اگر معیار صداقت قرار دے لیا جائے تو ہر بداخلاقی، پست فطرتی اور مفسدہ پردازی تہذیب وتمدن اور کمال و شرافت اور ہر کمال و شرف، علم و ہنر انسان کے لئے نقص وعیب بن جانا ضروری ہے۔

لیکن یہ افسوس ہے کہ دنیا بلند افراد کے طرز عمل کو ہمیشہ اپنی ذہنیت کے تحت میں دیکھتی ہے اور اس سے نتیجہ غلط نکالتی ہے۔

حضرت امیر المومنینؑ علی ابن ابی طالبؑ کی ذات دنیائے اسلام میں اسلامی تعلیمات کا مکمل نمونہ اور انسانی اوصاف وکمالات کا بہترین مجسمہ تھی۔

حضرت کی سیرت ان تمام خصوصیات سے مملو ہے جو ایک انسان کی کامل انسانیت کے جوہر سمجھے جاسکتے ہیں اس لئے حضرت کی سیرت میں یہ پہلو بہت زیادہ نمایاں نظر آتا ہے کہ حضرت نے کبھی اسلامی واجتماعی معاملات میں اپنی ذاتی مخالفت اور نفسانیت ۔دشمنی وعداوت کو دخل نہیں دیا اور نہ امانت و دیانت کے خیال کو ذاتی اغراض و مقاصد اور خیالات وجذبات پر مقدم کیا۔

دنیا کہ جو خود اپنے اور اپنے مزعومہ پیشواؤں کے طرز عمل کی بناء پر اس بات کی عادی ہوگئی ہے کہ وہ ہر بات میں شخصی اغراض کا پہلو مدنظر رکھے حضرت کے اس طرز عمل سے یہ نتیجہ نکالتی ہے کہ حضرت کو کوئی ذاتی اختلاف کسی سے تھا ہی نہیں اور آپ انتہائی ربط ومحبت اور دوستی ومودّت رکھتے تھے حالانکہ اگر تھوڑی سی بلند نظری کو صرف کیا جاتا تو معلوم ہوتا کہ ذاتی اختلاف کے ساتھ مصالح عامہ کی طرف صحیح رہنمائی کرنا وہ صفت ہے کہ جو انسانی اوصاف کا جوہر امتیاز ہے اور وہی امیر المومنینؑ کے طرز عمل میں نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔

یہ وہ خصوصیت ہے کہ جس سے امیر المومنینؑ کے واقعات زندگی میں تاریخ کے ورق مملو ہیں اور جن کی صورتیں مختلف ہیں۔

کارفرمایان سلطنت یعنی وہ کہ جنھوں نے امیر المومنینؑ کے تمام اوصاف وکمالات اور استحقاق واختصاص سے چشم پوشی کر کے خلافت کے تخت کو حاصل کیا اور ملت اسلامیہ کے تاجدار

اور صاحب اقتدار بن کر اصلاح قوم وملت کے واحد دعوے دار ہوئے۔ انھوں نے مشکلات کے موقع پر آپ سے مشورے لئے اور آپ نے وہ مشورے دیئے جو مفاد اسلامی کے لئے حقیقتاً صحیح اور مناسب وقت تھے اور جن کے خلاف ہونا مفاد اسلامی کے لئے انتہائی مضرت رساں تھا۔

ملاحظہ ہو پہلا مشورہ غزوۂ روم کے متعلق جو نہج البلاغہ میں مذکور ہے۔ جب حضرت عمر نے جنگ روم میں خود اپنے جانے کے متعلق حضرت سے مشورہ کیا حضرت نے فرمایا۔

قَدْ تَوَكَّلَ اللهُ لِأَهْلِ هٰذَا الدِّيْنِ بِإِعْزَازِ الْحَوْزَةِ وَسَتْرِ الْعَوْرَةِ وَالَّذِيْ نَصَرَهُمْ وَهُمْ قَلِيْلٌ لَا يَنْتَصِرُوْنَ وَمَنَعَهُمْ وَهُمْ قَلِيْلٌ لَا يَمْتَنِعُوْنَ حَيٌّ لَا يَمُوْتُ إِنَّكَ مَتٰى تَسِرْ إِلٰى هٰذَا الْعَدُوِّ بِنَفْسِكَ فَتَلْقَهُمْ فَتُنْكَبْ لَا تَكُنْ لِلْمُسْلِمِيْنَ كَانِفَةٌ دُوْنَ أَقْصٰى بِلَادِهِمْ فَلَيْسَ بَعْدَكَ مَرْجِعٌ يَرْجِعُوْنَ إِلَيْهِ فَابْعَثْ إِلَيْهِمْ رَجُلًا مُجَرَّبًا وَاحْفِظْ مَعَهُ أَهْلَ الْبَلَاءِ وَالنَّصِيْحَةِ فَإِنْ أَظْهَرَ اللهُ فَذَاكَ مَا تُحِبُّ وَإِنْ تَكُنِ الْأُخْرٰى كُنْتَ رِدْءًا لِلنَّاسِ وَمَثَابَةً لِلْمُسْلِمِيْنَ۔

''خداوند عالم نے اس دین کے متعلق یہ ذمہ داری لی ہے کہ اس کے مرکز کی تقویت ہو اور کمزوریوں کی پردہ پوشی ہو اور اس نے ان کی مدد کی جب وہ کم تھے کوئی مدد کرنے والا نہ تھا اور ان کی حفاظت کی جب وہ کم تھے خود اپنی حفاظت پر قادر نہ تھے، وہ اب بھی موجود ہے، زندہ ہے اور مرنے والا نہیں۔ اگر آپ خود دشمنوں کے مقابلہ کو گئے اور جنگ ہوئی اور آپ نے شکست کھائی تو مسلمانوں کے لئے کوئی جائے پناہ ان دشمنوں کی سرحد کے قریب نہ ہوگی اس لئے کہ آپ کے شکست کھانے کے بعد وہاں کوئی ایسا شخص نہ ہوگا جس کی طرف وہ رجوع کریں لہٰذا بہتر یہ ہوگا کہ آپ ایک تجربہ کار شخص کو روانہ کیجئے اور اس کے ساتھ بھیجئے ان اشخاص کو جو سختیاں جنگ کی اٹھانے کی طاقت اور صداقت واخلاص رکھتے ہوں اس صورت میں اگر خداوند عالم نے غلبہ عطا کیا تو یہی آپ کا مقصد ہے اور اگر معاملہ نوع دگر ہوا تو آپ تو یہاں موجود ہی ہیں جن کے پاس مسلمان واپس آئیں گے اور پناہ لیں گے۔''

کتنے افسوس کا امر ہے کہ اس مشورہ سے یہ نتیجہ نکالنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ حضرت علیؑ اپنے زمانہ کے بادشاہ سے انتہائی محبت رکھتے تھے۔ اور ان کی جان کو عزیز سمجھتے تھے جب ہی حضرت نے فرمایا کہ ایسا نہ ہو کہ آپ جائیں اور شہید ہو جائیں تو پھر مسلمان بے سرپرست رہ جائیں گے اور کوئی ان کا والی ووارث نہ ہوگا۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ یہ خیال حقیقت حال اور مشورہ کے الفاظ سے بہت دور ہے۔

اس امر پر ذرا سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت ہے کہ حضرت علیؑ نے مشورہ کے موقع پر خلیفۂ وقت کو جنگ کے لئے خود جانے سے کیوں منع کیا؟

کیا حضرت علیؑ کی سیاسی رائے یہی تھی کہ جو بادشاہ وقت اور خلیفۂ زمانہ ہو اس کو کبھی جنگ میں خود جا کر شریک نہ ہونا چاہئے بلکہ خود اپنی جگہ پر بیٹھ کر افواج کو بھیجنا اور دور ہی دور سے ان کو لڑانا چاہئے؟

ایسا تو نہیں ہے ورنہ خود حضرت جبکہ ظاہری طور پر سلطنت و بادشاہت کے مالک ہوئے تو اس پر عمل کرتے اور خود مدینہ میں بیٹھ کر افواج کو روانہ کرتے یا کم از کم میدان جنگ کے قریب ہی لیکن معرکۂ جنگ سے دور کوئی اپنا مرکز قائم کرتے اور خود جنگ میں شریک نہ ہوتے حالانکہ ہم دیکھتے ہیں کہ جتنی لڑائیاں آپ کے زمانہ میں ہوئیں سب میں آپ میدان جنگ میں موجود بلکہ تمام سپاہیوں کے آگے تلوار کھینچے ہوئے دشمنوں کی صفوں کے اندر شمشیر زنی کرتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں لہٰذا یہ خیال تو صحیح نہیں ہے کہ حضرت کی رائے خلیفۂ اسلام کے متعلق یہی تھی کہ اس کو اپنا مرکز نہ چھوڑنا چاہئے اور خود جنگ میں جا کر شریک نہ ہو۔

پھر کیا یہ تھا کہ حضرت کو خلیفۂ وقت سے محبت اتنی تھی کہ وہ ان کے میدان جنگ میں جانے کے روادار نہ تھے اور یہ اندیشہ تھا کہ کہیں وہ شہید نہ ہو جائیں تو پھر مسلمانوں کا کوئی پرسان

حال نہ ہوگا۔

یہ خیال بھی افسوس ہے کہ صحیح نہیں ہے اس لئے کہ حضرت امیرؑ کو خلیفۂ وقت سے کتنی ہی محبت کیوں نہ ہو، لیکن اس محبت کے مثل نہیں ہوسکتی جو آپ کو اپنے بھائی مشفق، استاد اور معلم روحانی حضرت رسول اکرمؐ کے ساتھ تھی۔ حالانکہ تاریخ اسلام اس بات کی گواہ ہے کہ بڑی بڑی لڑائیوں میں ہمیشہ رسالتمآبؐ میدان جنگ میں موجود ہوتے تھے۔ اور کبھی حضرت علیؑ نے حضرتؐ کو یہ مشورہ نہ دیا کہ حضور کا جنگ میں تشریف لے جانا مناسب نہیں اور حضور مدینہ ہی میں تشریف رکھیں اور لشکر روانہ فرمائیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ حضور شہید ہوجائیں پھر مسلمانوں کا کوئی والی ووارث نہ ہوگا باوجودیکہ جنگ احد میں رسالتمآبؐ کو اتنے زخم آگئے تھے کہ حضرت کی زندگی معرض خطر میں نظر آرہی تھی اور بہت قریب تھا کہ حضرتؐ شہید ہوجائیں لیکن اس کے بعد بھی جنگ خندق میں حضرتؐ خود میدان جنگ میں موجود تھے اور حضرت علیؑ یا کسی صحابی نے بھی حضرت کو مدینہ ہی میں قیام فرمانے کا مشورہ نہیں دیا۔

حضرت علیؑ جتنا بھی خلیفۂ وقت کو دوست رکھتے لیکن اپنے فرزند در فرزندان رسول یعنی حسنین علیہما السلام سے زیادہ دوست نہ رکھتے تھے۔

حالانکہ صفین وجمل ونہروان کی لڑائیوں میں یہ دونوں صاحبزادہ اپنے پدر بزرگوار کے پہلو بہ پہلو جنگ میں شریک تھے اور حضرت نے کسی موقع پر بھی ان کو جنگ سے علٰحدہ کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی۔

کیا ان تمام واقعات کی موجودگی میں یہ دل کو لگتی ہوئی بات ہے کہ حضرت علیؑ نے صرف محبت کی وجہ سے حضرت عمر کو جنگ میں جانے سے روکا۔ اور پھر محبت کی بناء پر جو بات ہو وہ حقیقتاً مشورہ نہیں ہوا کرتا، اسے حضرت عمر کو ماننے کی کیا ضرورت تھی اور اگر حقیقتاً وہ جنگ میں جانے کا ارادہ رکھتے تھے تو حضرت علیؑ کے صرف اس محبتانہ روکنے سے وہ رک کیوں گئے اور جنگ میں جانے کا خیال ترک کیوں کیا۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ حقیقت حال کچھ اور ہے اور حضرت علیؑ کا مشورہ کسی اور اندیشہ پر مبنی ہے جس کو حضرت نے اپنے الفاظ میں ظاہر بھی فرمادیا ہے لیکن عام افراد کی حضرت خلیفۂ ثانی کے ساتھ خوش اعتقادی اور جذبۂ اخلاص ومحبت نے اس پر غور کرنے کا موقع نہیں دیا اور انھوں نے اس کو دوسرا لباس پہنادیا۔

حضرت علیؑ کے یہ الفاظ خاص طور سے توجہ کے قابل ہیں

إِنَّكَ مَتٰى تَسِرْ إِلٰى هٰذَا الْعَدُوِّ بِنَفْسِكَ فَتَلْقَهُمْ فَتُنْكَبْ لَا تَكُنْ لِلْمُسْلِمِيْنَ كَانِفَةٌ دُوْنَ أَقْصٰى بِلَادِهِمْ فَلَيْسَ بَعْدَكَ مَرْجِعٌ يَرْجِعُوْنَ إِلَيْهِ۔

اس کا ترجمہ جو کیا جاتا ہے اور ہمارے پیش نظر ہے وہ یہ ہے ''بتحقیق جس وقت آپ اس دشمن کے سامنے خود جائیں گے اور خود ان سے مقابلہ کریں گے تو اگر کہیں شہید ہوگئے تو پھر مسلمانوں کو کوئی جائے پناہ ان کے آخری شہروں تک کہیں نہ ملے گی کیونکہ آپ کے بعد کوئی ایسا شخص نہیں جس کی طرف مسلمان رجوع کریں۔''

افسوس ہے کہ یہ ترجمہ ان اشخاص کے ذاتی مقصد وخواہش کے کتنا ہی مطابق ہو لیکن ان الفاظ سے کوئی تعلق نہیں رکھتا جو اصل مشورہ کے اندر موجود ہو۔

''تنکب'' کی لفظ کے معنی شہید ہوگئے'' کم سے کم موجودہ عربی لغت کی کتابوں میں تو نایاب ہیں۔ بلکہ ''نکب'' کے معنی ہیں ''عدل'' یعنی اپنی جگہ سے ہٹنا اور منحرف ہونا اور یا ''کسر'' یعنی شکست کھانا۔

بہرحال معلوم ہوتا ہے کہ امیر المومنینؑ نے اس اندیشہ کا اظہار نہیں کیا ہے کہ آپ شہید ہوجائیں گے بلکہ یہ خیال ظاہر فرمایا ہے کہ کہیں آپ کو میدان جنگ سے ہٹنے کی ضرورت نہ ہو اور شکست اٹھانا نہ پڑے۔

حقیقت یہ ہے کہ رسالتمآبؐ کے ساتھ کی امتحانی لڑائیوں

نے تمام افراد و مہاجرین اور بالخصوص ممتاز ہستیوں کے ثبات و استقلال اور بلند حوصلگی و پرجگری کی پوری آزمائش کر لی تھی اور کوئی پردہ باقی نہ رہ چکا تھا۔

احد و احزاب، خیبر و حنین کے تلخ تجربے حضرت علیؑ کے پیش نظر تھے اور وہ مرقع سامنے تھا کہ جب میدان جنگ کی سنسان فضا اپنی تنہائی کے سناٹے کے ساتھ ان پرجگر اور جاں نثار صحابیان رسولؐ کو دعوت دے رہی تھی اور یہ مڑ کر بھی نہ دیکھتے تھے۔

خیبر کی یادگار سپہ سالاری اور افسری فوج بھی سامنے تھی جس میں تمام فوج کے متفقہ آواز کی بناء پر شکست کی پوری ذمہ داری سالار کی بے ثباتی کے اوپر تھی اور حقیقت یہ ہے کہ سالار فوج کی کمزوری و بے ثباتی کے بعد ناممکن ہے کہ فوج کے قدم ٹھہریں اور وہ کوئی کامیابی حاصل کر سکے۔

رسالتمآب کے زمانہ میں جو لڑائیاں پیش آ چکی تھیں اور جن میں ہمیشہ فتح کا سہرا اسلام کے سر رہا اور زبردست سے زبردست بہادر لشکر مخالف کے زیر تیغ ہوئے انھوں نے اسلام کا رعب و دبدبہ قائم کر دیا تھا اور رسالتمآبؐ کی ان پیشین گوئیوں نے کہ میری امت کسریٰ و قیصر کے ممالک پر قابض ہوگی۔ سلطنت کے بھوکے عربوں میں ایک خاص جوش و ولولہ کی روح پھونک دی تھی جس کا نتیجہ یہ تھا کہ وہ دشمن کے سامنے اپنی جان سے ہاتھ دھو کر جاتے تھے۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ فتح ہوتی تھی اور اسلام کی فاتحانہ طاقت کی ہیبت دلوں پر بڑھتی جاتی تھی اور یہ ہیبت خود ایک مستقل سبب ہوا کرتی ہے۔ افواج مخالف کی ہزیمت کا۔

ان فتوحات یا افواج اسلامی کے غلبہ کا فلسفہ کتنا ہی عمیق کیوں نہ ہو لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ حضرت عمر کے ساتھ اتنا ہی تعلق رکھتا ہے کہ وہ افواج آپ کے روانہ کئے ہوئے اور آپ کی جانب سے بھیجے ہوئے تھے۔ بالکل اسی طرح جیسے آج کل کے سلاطین جنگ کے بھڑکتے ہوئے شعلوں سے علٰحدہ رہ کر عام مخلوق کو قربانی کے لئے آگے بڑھاتے اور ان کو پروانہ صفت اپنے شمع مقصد کی نذر کرتے اور ہزاروں لاکھوں آدمیوں کو کٹوا کر فاتح کا لقب خود اپنے لئے حاصل کرتے ہیں وہ ہی صورت اس زمانہ کی لڑائیوں کی تھی۔ جنگ کے خطرناک مصائب تلواروں نیزوں کا مقابلہ، موت کے منہ میں جانا یہ سب تمام مسلمانوں کا کام تھا اور حقیقی فتح کا سہرا انھیں کے سر۔

حضرت عمر ان معاملات میں خود انتہائی درجہ محتاط تھے اور ایسے خطرناک موقعوں پر آگے بڑھنا اور مہالک میں اپنے تئیں ڈالنا پسند نہ کرتے تھے وہ میدان جنگ کی سختیوں سے واقف تھے اور خود اپنی ذاتی حالت اور دل کی طاقت سے دوسروں کی بہ نسبت زیادہ مطلع۔

لیکن یہ واقعہ ہے کہ اکثر اوقات دوسرے اشخاص کے مبالغہ آمیز بیانات انسان کے احساسات وتخیلات پر ایسا اثر ڈالتے ہیں کہ وہ خود اپنے متعلق دھوکہ کھا جاتا ہے۔

خوشامدیوں سے دنیا خالی نہیں اور خوش اعتقادی بھی کسی خاص زمانہ سے مخصوص نہیں ہے جیسے آج کل کے مورخین اور ارباب سیر بڑے بلند وبانگ دعوے کے ساتھ حضرت عمر کو اسلامی فاتح اعظم کہتے اور تمام اسلامی فتوحات اور افواج اسلامی کے غلبہ کا سہرا آپ کے سر باندھتے ہیں حالانکہ اس زمانہ میں خوشامد کا تو کوئی موقع ہی نہیں جو کچھ بھی ہے وہ خوش اعتقادی ہے۔ اس زمانہ میں خود حضرت عمر کے منہ پر خوشامد اور خوش اعتقادی کے مخلوط جذبہ کا نتیجہ تھا کہ عام طور پر کہا جاتا ہوگا کہ "یہ سب حضور کی برکت ہے اور آپ کا اثر ہے۔ پھر جب یہاں بیٹھے بیٹھے یہ حال ہے تو حضور خود اگر میدان جنگ میں پہونچ جائیں تو کیا ہوگا۔ سپاہیوں کے دل ہاتھ ہاتھ بھر کے ہو جائیں گے، دنیا کو زیروزبر کر دیں گے، پہاڑی بھی سامنے آئے تو ہٹا کر راستہ پیدا کریں گے اور ایک دم کے اندر میں ایرانی ملک پر قبضہ کریں گے۔"

یہ خیالات ہوں گے جو عام طور پر حضرت عمر کے گوش زد کئے جاتے ہوں گے جن کا اثر یہ تھا کہ حضرت عمر تمام سابق تلخ تجربوں کے باوجود جنگ کے میدان کو اپنے فتحمند قدموں سے

عزت دینے پر آمادہ ہو گئے۔

یہ وہ موقع تھا کہ مدبر اسلام اور حقیقی محافظ ملت حضرت علیؑ بن ابی طالبؑ کو اسلامی عزت و وقار کی نسبت خطرہ کا احساس ہوا اور انھوں نے مناسب الفاظ میں حضرت عمر سے اپنے خیالات کا اظہار کر دیا۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ رسالتمآب کے زمانہ میں متعدد بار حضرت عمر کو ذمہ دارانہ حیثیت سے روانہ کیا گیا لیکن وہ ایسا نازک موقع نہ تھا۔ حضرت عمر کی شخصیت اس وقت کتنی نمایاں سہی لیکن ایک فرد مسلمان سے زیادہ نہ تھی۔ اگر صورت حال دگرگوں ہوئی اور شکست کی ناگوار صورت آئی تو وہ کتنی خجالت آمیز سہی لیکن اسلام کی شکست کی مرادف نہیں ہوسکتی۔ رسولؐ اسلام تو موجود تھے ہی ایک دوسرے قابل اعتماد شخص کے ذریعہ سے وہ اس کمزوری کا تدارک کر دیتے اور نتیجہ میں دشمنوں کو شکست دیتے تھے۔ جیسا کہ برابر ہوتا رہا اور تاریخ اسلام میں وہ تمام واقعات محفوظ ہیں۔

لیکن اب صورت حال یہ تھی کہ وہ جن اسباب کی بناء پر ہو بہرحال حضرت عمر کو دنیائے اسلام کے لئے ایک ممتاز حیثیت حاصل ہو چکی تھی اور خود مسلمانوں کے اندر آپ کے متعلق کتنا ہی اختلاف کیوں نہ ہو لیکن کفار کی نگاہ میں آپ بہرحال بادشاہ اسلام اور خلیفۂ مسلمین اور جانشین رسولؐ کی حیثیت رکھتے تھے اور اس لئے اگر خدانخواستہ آپ کے میدان جنگ جانے پر کوئی ناگوار صورت پیش آتی اور آپ کو میدان جنگ چھوڑنا یا جنگ چھوڑنا یا جنگ سے علٰحدہ ہونا پڑتا تو یہ اسلام کی شکست ہوتی جس کے بعد پھر اسلام کو بارآوری حاصل نہیں ہوسکتی تھی۔

حضرت عمر یقیناً خود موقع کی نزاکت کا احساس رکھتے تھے اور ان کا دل اس اہم اقدام کو کرتے ہوئے ہچکچا رہا تھا اور قیاس یہ بتلاتا ہے کہ صرف سرداران لشکر یا دوسرے عام افراد کا یہ مطالبہ اور اصرار رہا ہوگا کہ جب کہ رسول برابر لڑائیوں میں خود شریک ہوتے تھے خلیفۂ رسول کیوں گھر میں بیٹھے رہیں اور میدان جنگ میں مجاہدین کی صفوں کے اندر موجود نہ ہوں۔

اس لئے کہ حضرت عمر کو گونہ تردد ہوا اور اسی لئے انھوں نے حضرت علیؑ سے مشورہ کیا۔

حضرت علیؑ کے لئے یہ بہت نازک موقع تھا وہ بات جو آپ کو جنگ میں جانے کا مشورہ دینے سے مانع تھی وہ ایسی نہیں کہ اس کو صاف لفظوں میں کہہ دیا جائے۔ دوسری طرف مشورہ کے موقع پر صحیح رائے اور اپنے اصلی خیال کا ظاہر کر دینا شریعت اسلام اور انسانیت و اخلاق کا اہم فرض ہے اور پھر جبکہ مشورہ اتنا اہم ہے جس میں اسلام کے وقار و عزت اور توہین و شکست کا سوال درپیش ہے۔

مگر کیا کہنا اس ہم صفیر زبان وحی اور ترجمان حقائق قرآنی کی بلاغت کا جس نے سب کچھ اس شائستہ پیرایہ میں کہہ دیا جس کو آج دنیا انتہائی مدح وثنا کے الفاظ سمجھ کر اس کو مقام افتخار میں پیش کرتی اور اپنے ممدوح کے لئے طرۂ امتیاز سمجھتی ہے۔

پہلے حضرت نے ان خوشامدانہ نمائشی چاپلوسی کرنے والوں کے خیال کی غلطی ظاہر کی ہے جو حضرت عمر کے یہ ذہن نشین کرانا چاہتے تھے کہ یہ سب حضور کا فیض ہے اور یہ تمام فتوحات آپ کے دم قدم کی برکت سے ہیں اور اگر آپ جنگ میں پہونچ جائیں تو پھر اس سے زیادہ فتوحات ظاہر ہوں گے حضرت نے اس خیال کو رد کرتے ہوئے ارشاد فرمایا۔

''یہ تو خدا نے (اپنے وعدے کے ذریعہ سے) ذمہ داری کر لی ہے کہ وہ اسلام کی طاقت وشوکت میں اضافہ کرے گا اور اس میں کمزوری پیدا نہ ہونے دے گا۔

وہ خدا جس نے ان مسلمانوں کی امداد کی اس وقت جب یہ بیکس اور بے بس تھے کوئی مدد کرنے والا نہ تھا اور ان کی حفاظت کی جب وہ کم تھے۔ وہ اب بھی موجود ہے اور اس کے لئے فنا نہیں ہے، لہٰذا یہ تو سمجھنا ہی نہ چاہئے کہ اگر آپ نہ ہوئے تو اسلام کو شوکت حاصل ہی نہیں ہوسکتی) اس کے بعد آپ حضرت عمر کی روانگی سے اختلاف کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔ آپ اگر دشمن کی طرف بنفس نفیس تشریف لے گئے اور دشمن کا سامنا ہوا اور اس

وقت (خدانخواستہ) آپ کو میدان جنگ سے ہٹنا پڑا یا (نصیب دشمناں) شکست ہوئی تو (افسر کے قدم اٹھ جانے کے بعد) پھر مسلمانوں کا کوئی مرکز اس دور و دراز ملک میں نہ ہوگا اور آپ کے (شکست کھانے کے بعد کوئی ایسا نہ رہے گا جس کی طرف وہ رجوع کریں۔

اس وقت تو یہ ہے کہ شاہی مرکز مدینہ میں موجود ہے اور اگر ایک افسر فوج کو شکست ہوئی اور لشکر کے قدم اٹھے تو افواج منظم طریقہ سے واپس آئیں گے اور دوسرا بہادر افسر بھیجا جا سکتا ہے۔ لیکن اگر بادشاہ خلیفۃ المسلمین کو شکست ہوئی تو پھر اس کے تدارک کی کوئی صورت نہیں باقی رہتی، اس صورت میں یقینا مسلمانوں کا شیرازہ منتشر ہوجائے گا اور وہ آندھی میں اڑتے ہوئے پتوں کی طرح پراگندہ ہوجائیں گے۔

اس کے بعد حضرت صورت حال کے متعلق اپنی ذاتی رائے یہ پیش فرماتے ہیں کہ ''بہتر ہے آپ ان کی جانب ایک ایسے شخص کو روانہ فرمائیں جسے لڑائی کا تجربہ ہو اور اس کے ساتھ ایسے افراد کو بھیجئے جو لڑائی کی سختیوں کو برداشت کر سکیں اور اسلام کے خیرخواہ ہوں (لشکر اور سردار لشکر کے یہ اوصاف و قیود حضرت علیؑ کے نقطۂ نظر کو بہت روشن طریقہ سے واضح کرتے ہیں۔)

اس صورت میں اگر خداوند عالم نے کامیابی عطا فرمائی تو کیا کہنا اور اگر پھر بھی شکست ہوئی تو آپ تو ہیں ہی وہ فوج آپ کے پاس پلٹ کر واپس آئے گی اور آپ دوسری فوج روانہ کر سکیں گے۔

یہ تھا مشورہ جو حضرت نے دیا اور حقیقۃً مشورہ ایسا تھا جسے حضرت عمر کے دل نے قبول کرلیا اور انھوں نے جنگ میں جانے کے خیال کو ترک کر دیا۔

دوسرا مشورہ غزوۂ فارس کے متعلق

جب سرداران لشکر وغیرہ نے پھر حضرت عمر کو پریشان کیا اور یہ کہا کہ اگر آپ جنگ میں چلے جائیں تو سب کام بن جائیں اس لئے کہ دشمنوں کی تعداد زیادہ ہے۔ مسلمانوں کا لشکر کم ہے۔ اگر آپ کہیں قدم اٹھائیں اور چل کھڑے ہوں تو قبائل عرب میں یہ خبر بجلی کی طرح دوڑ جائے گی کہ بادشاہ سلامت خود جنگ کے لئے تشریف لے جا رہے ہیں اور اس طرح تمام اطراف وجوانب سے مور و ملخ کی طرح لشکر سمٹ آئے گا۔ حضرت عمران لوگوں کے اصرار سے پھر پریشان ہوئے اور وہی پہلا نسخہ عمل میں لائے کہ حضرت علی سے مشورہ لیں اور جب آپ اختلاف کریں تو یہی آپ کے جنگ سے باز رہنے کی سند قرار پائے۔ اس موقع پر بھی کوئی تازہ امر نہ تھا۔ حضرت علیؑ کی نظر میں تمام وہی پہلو موجود تھے جو گذشتہ مشورہ میں آپ کے سامنے تھے۔ چنانچہ اس موقع پر حضرت عمر سے جنگ میں تشریف لے جانے پر اصرار کرنے والوں کے خیالات کو مدنظر رکھتے ہوئے حضرت نے جو خیالات ظاہر فرمائے ہیں وہ حسب ذیل ہیں۔

''اس امر یعنی اسلام کی فتح و نصرت یا شکست و ہزیمت، کثرت و قلت پر موقوف نہیں رہی ہے، یہ تو خدا کا دین ہے کہ جس کو اس نے غالب کیا اور اسی کی فوج ہے جس کی اس نے امداد کی، یہاں تک کہ وہ پہنچی کامیابی کے اس درجہ تک کہ جہاں تک پہونچی اور ہم سے خداوند عالم کی جانب سے وعدہ ہو چکا ہے اور وہ اپنے وعدہ کو پورا ضرور کرے گا اور اپنے لشکر کی امداد کرے گا۔

امور انتظامی کے ساتھ قائم یعنی خلافت مسلمین کے ذمہ دار شخص کی حیثیت وہ ہوتی ہے جو رشتۂ قلادہ کو موتیوں کی نسبت حاصل ہے کہ یہ ان کی شیرازہ بندی کرتا اور ان کی جمع آوری رکھتا ہے، اگر یہ رشتہ ٹوٹ جائے تو موتی بکھر جائیں گے اور تتر بتر ہوجائیں گے اور کبھی ان کا اجتماع نہ ہو سکے گا (یہ حضرت نے ایک کلیہ کی صورت سے ارشاد فرمایا ہے) لہٰذا اس سے یہ نتیجہ بالخصوص نہیں نکالا جاسکتا کہ ''حضرت علیؑ نے حضرت عمر کی ذات والا صفات کو مسلمانوں کا مایہ نظام فرمایا اور فرمایا کہ یہ نظام آپ کے بعد قیامت تک پھر کبھی نہ ہوگا اس لئے کہ آپ قیم بالامر ہیں۔'' یہ نتیجہ تو جب نکلتا جب حضرت خصوصیت کے ساتھ فرماتے کہ آپ کی مثال وہ ہے جو رشتہ کو موتیوں کے ساتھ ہوتی

ہے۔ بیشک کلیۃً ایسا ہی ہے کہ ہر بادشاہ اپنے زیر حکومت رعایا کے لئے باعث انتظام وشیرازہ بندی ہوتا ہے اور اگر وہ ہٹ جائے تو شیرازہ منتشر ہوجائے گا۔ اور جب تک پھر کوئی بحیثیت بادشاہ اس شیرازہ کو مجتمع نہ کرے وہ مجتمع نہیں ہوسکتا۔

اس کے بعد حضرت اس خیال کو رد کرتے ہوئے کہ مسلمانوں کی تعداد دشمنوں کے مقابلہ میں کم ہے فرماتے ہیں کہ عربوں کی تعداد (بمقابلہ اپنے مخالفین کے اگرچہ کم ہے لیکن وہ زیادہ تعداد کے ہم وزن ہے۔ اسلام کے سبب سے اور ان کے لئے عزت حاصل ہے ان کے اجتماع کے سبب سے آپ کو چاہئے کہ آپ اپنی جگہ پر قطب کی طرح قائم رہیں اور عربوں کو چکی کی طرح یہیں سے بیٹھے بیٹھے گردش دیں اور انہی کو آتش حرب میں ڈالیں اس لئے کہ اگر آپ یہاں سے چلے گئے تو یہ تو ہوگا (جیسا کہ ان لوگوں کا خیال ہے) کہ چاروں طرف سے عرب ٹوٹ پڑیں گے لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اسلامی بلاد خالی ہوجائیں اور آپ کو ان مقامات کا خیال جن کو آپ نے بے حفاظت چھوڑے ہیں زیادہ اہم معلوم ہونے لگے۔ اور پھر خاص بات تو یہ ہے کہ عجم آپ کو میدان جنگ میں دیکھیں گے تو کہیں گے کہ یہ شخص عرب کی جڑ ہے اگر اس کو کاٹ ڈالو گے تو راحت پاجاؤ گے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ آپ پر شدت سے حملہ کریں گے اور پوری نظر ان کی آپ پر ہوگی۔ (ایک بہادر کے جوش وولولہ کے لئے یہ الفاظ تازیانہ کا کام کرسکتے ہیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ حضرت عمر محتاط تھے حضرت علیؑ نے جو یہ پہلو پیش نظر کردیا تو آپ نے خود جنگ میں جانے کے خیال کو ترک فرمادیا۔)

باقی رہا یہ جو آپ نے ذکر کیا کہ فوج عجم مسلمانوں کے قتال کے لئے روانہ ہوچکی ہے تو اللہ سبحانہ کو ان کی یہ روانگی آپ سے زیادہ ناپسند ہے اور وہ جس چیز کو ناپسند کرے اس کے بدل دینے پر قادر ہے اور جو آپ نے ان کی کثرت بیان کی تو بات یہ ہے کہ ہم لوگ زمانہ گذشتہ میں اپنی کثرت کے برتے پر جنگ نہ کرتے تھے بلکہ خدا کی مدد پر بھروسہ کرکے لڑتے تھے۔''

(طرز کلام سے ظاہر ہے کہ یہ حقائق الٰہیہ مخاطب کے پیش نظر نہیں ہیں اور حضرت علیؑ ان کے اوپر خاص طور سے توجہ دلارہے ہیں۔)

یہ مشورے خالص ہندوستانی ہمدردی اور اسلامی مفاد کے لحاظ سے تھے جن میں ذاتی دوستی دشمنی کا سوال بلند خیال اور تنگ نظری سے علٰحدہ افراد کے یہاں پیدا ہی نہیں ہوتا۔

اسی طرح مسائل شرعیہ میں امداد لینے کے موقع پر حضرت علیؑ کا مسائل سے مطلع کردینا اور احکام شرعیہ کا بتلادینا یا قضایا کا فیصلہ کردینا یہ تمام باتیں اسی نوعیت سے تعلق رکھتی ہیں۔

کیا اس موقع پر حضرت علیؑ ایسی پاک نفس وپاکباز بلکہ معلم انسانیت ہستی سے یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ اگر کسی سے دشمنی یا اختلاف خیال رکھتے ہوں تو اس دشمنی کی بناء پر مشورہ کے موقع پر غلط رائے دیں۔ مسائل شرعیہ غلط بتلائیں اور قضایا کا فیصلہ کچھ کا کچھ کردیں۔

پھر اگر یہ حضرت کے تقویٰ اور طہارت اور قدس وحقانیت کے خلاف امر ہے تو اس مشورہ کے دینے، مسائل کے بتلانے اور قضایا کے صحیح طور سے فیصلہ کردینے کو اس امر کی دلیل نہیں قرار دیا جاسکتا کہ حضرت کو کوئی ذاتی اختلاف نہ تھا اور وہ حضرت عمر کو انتہائی دوست رکھتے تھے۔

فرض شناسی اور ذمہ داری کا احساس اور دیانت و امانتداری وہ چیز ہے جس میں دوست و دشمن کی تفریق باقی نہیں رہتی، تاریخ عالم اس بات کی گواہ ہے کہ رسالتمآبؐ کفار قریش کے امانتدار تھے یعنی وہ لوگ آپ کے پاس امانتیں رکھواتے تھے اور حضرت ان کی اس طرح حفاظت کرتے تھے کہ حضرت کو امین کا لقب مل گیا تھا۔ یہ سلسلہ بعثت کے ہوتے ہی ختم نہیں ہوگیا بلکہ بعد بعثت ہجرت کے موقع تک کفار قریش کی امانتیں آپ کے پاس موجود تھیں اور حضرت نے ان امانتوں کی حفاظت کا اتنا اہتمام کیا کہ اپنے عزیز ترین بھائی علیؑ بن ابی طالبؑ کو انہی امانتوں کے ادا کرنے کے لئے انتہائی خطرہ کے اندر مکہ معظمہ میں چھوڑ کر ہجرت فرمائی۔ کیا میں دنیائے اسلام سے دریافت

کرسکتا ہوں کہ حضرت رسول کفار قریش سے کوئی محبت والفت رکھتے تھے یا اختلاف؟ پہلے جز و کی نفی آیۂ قرآنی سے ہوجاتی ہے کہ لَاتَجِدُ قَوْمًا یُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ یُوَادُّوْنَ مَنْ حَآدَّاللّٰہَ وَرَسُولَہٗ۔ (سورہ مجادلہ آیت ۲۲)

مومن اور کافر میں دوستی ناممکن ہے۔تو ماننا پڑے گا کہ حضرت کو کفار قریش سے محبت نہ تھی بلکہ اختلاف تھا۔ پھر ان کی امانتوں کی حفاظت میں اتنا اہتمام!اس کے کیا معنیٰ؟ یہ وہی فرض شناسی اور دیانت وامانت کا لحاظ تھا جس میں محبت وعداوت کے سوال کا موقع ہی نہیں۔

اگر حضرت رسولؐ کا کفار قریش کی امانتیں اپنے پاس رکھنا اور ان کی حفاظت میں انتہائی اہتمام فرمانا اس امر کی دلیل نہیں ہوسکتا کہ آپ ان سے کوئی ذاتی اختلاف نہ رکھتے تھے تو ان کے وصی وجانشین حضرت علیؑ کا بھی اپنے مخالفین کے لئے مشورہ دینے مسائل بتلانے قضایا کا فیصلہ کرنے میں امانت و دیانت داری کے فرض کو ملحوظ رکھنا اس بات کی دلیل نہیں ہوسکتا کہ آپ ان سے کوئی ذاتی اختلاف نہ رکھتے تھے۔

خلیفۂ سوم سے تخاطب

نہج البلاغہ مطبوعہ مصر جلد ا ص ۳۲۲، سے امیرالمومنینؑ کا وہ مخاطبہ پیش کیا جاتا ہے جو آپ نے حضرت عثمان سے اس وقت کیا ہے جب لوگوں نے ان کے خلاف شورش برپا کی ہے اور جناب امیرؑ سے آکر ان کے شکایات پیش کئے ہیں۔ یہ واقعہ ہے کہ حضرت عثمان کے زمانہ میں مسلمانوں کے ساتھ انتہائی مظالم ہورہے تھے۔اور اسلامی ممالک میں ایک بدنظمی کا دور دورہ تھا۔ بڑے بڑے صحابہ کی زدوکوب ہوتی تھی۔اموال غنیمت اپنے عزیزوں کو تقسیم کردیئے جاتے تھےاور دوسرے مسلمان محروم رہتے تھے۔

یہی تمام باتیں تھیں جنھیں امیرالمومنینؑ کے سامنے پیش کیا گیا اور یہ خواہش کی گئی کہ آپ عثمان کو جاکر سمجھایئے۔ یہ موقع ہے کہ آپ ان کے پاس تشریف لے گئے اور حسب ذیل الفاظ میں ہدایت شروع کی۔

وَاللّٰہِ مَا اَدْرِیْ مَا اَقُوْلُ لَکَ مَا اَعْرِفُ شَیْئًا تَجْهَلُهٗ وَلَا اَدُلُّكَ عَلٰی اَمْرٍ لَا تَعْرِفُهٗ اِنَّكَ لَتَعْلَمُ مَا نَعْلَمُ مَا سَبَقْنَاكَ اِلٰی شَیْءٍ فَنُخْبِرَكَ عَنْهُ وَلَا خَلَوْنَا بِشَیْءٍ فَنُبَلِّغَهٗ وَقَدْ رَأَیْتَ كَمَا رَأَیْنَا وَسَمِعْتَ كَمَا سَمِعْنَا وَصَحِبْتَ رَسُوْلَ اللّٰہِ كَمَا صَحِبْنَا وَمَا ابْنُ اَبِیْ قُحَافَةَ وَلَا ابْنُ الْخَطَّابِ اَوْلٰی بِعَمَلِ الْحَقِّ مِنْكَ وَاَنْتَ اَقْرَبُ اِلٰی رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْهِ وَاٰلِهٖ وَسَلَّمَ وَشِیْجَةَ رَحِمٍ مِنْهُمَا وَقَدْ نِلْتَ مِنْ صِهْرِهٖ مَا لَمْ یَنَالَا فَاللّٰہَ اللّٰہَ فِیْ نَفْسِكَ! فَاِنَّكَ وَاللّٰہِ مَا تُبَصَّرُ مِنْ عَمًی وَلَا تُعَلَّمُ مِنْ جَهْلٍ وَاِنَّ الطُّرُقَ لَوَاضِحَةٌ وَاِنَّ اَعْلَامَ الدِّیْنِ لَقَائِمَةٌ فَاعْلَمْ اَنَّ اَفْضَلَ عِبَادِ اللّٰہِ عِنْدَ اللّٰہِ اِمَامٌ عَادِلٌ هُدِیَ وَهَدٰی فَاَقَامَ سُنَّةً مَعْلُوْمَةً وَاَمَاتَ بِدْعَةً مَجْهُوْلَةً وَاِنَّ السُّنَنَ لَنَیِّرَةٌ لَهَا اَعْلَامٌ وَاِنَّ الْبِدَعَ لَظَاهِرَةٌ لَهَا اَعْلَامٌ وَاِنَّ شَرَّ النَّاسِ عِنْدَ اللّٰہِ اِمَامٌ جَائِرٌ ضَلَّ وَضُلَّ بِهٖ فَاَمَاتَ سُنَّةً مَاْخُوْذَةً وَاَحْیَا بِدْعَةً مَتْرُوْكَةً وَاِنِّیْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْهِ وَاٰلِهٖ یَقُوْلُ یُؤْتٰی یَوْمَ الْقِیَامَةِ بِالْاِمَامِ الْجَائِرِ وَلَیْسَ مَعَهٗ نَصِیْرٌ وَلَا عَاذِرٌ فَیُلْقٰی فِیْ نَارِ جَهَنَّمَ فَیَدُوْرُ فِیْهَا كَمَا تَدُوْرُ الرَّحٰی ثُمَّ یَرْتَبِطُ فِیْ قَعْرِهَا۔

”خدا کی قسم میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں تم سے کیا کہوں،کوئی نئی بات ایسی نہیں ہے جو مجھے معلوم ہو اور تمہیں معلوم نہ ہو اور نہ کوئی ایسی اطلاع مجھے ہے جو تمہیں حاصل نہ ہو۔تم سے پہلے مجھے کسی حالت کی ایسی خبر نہیں پہونچی ہے جس کی تمہیں اطلاع دوں اور نہ ہمیں تنہا کوئی بات پہونچی ہے جو تم کو پہونچائی جائے حالانکہ تم نے بھی (سیرت رسول کو) دیکھا ہے جس طرح ہم نے دیکھا ہے اور (اقوال رسول کو) سنا ہے جس طرح ہم نے سنا ہے اور ہماری طرح رسول اللہ کی صحبت بھی اٹھائی ہے اور ابوبکر اور عمر حق پر عمل کرنے کے کچھ تم سے زیادہ حق دار نہ تھے حالانکہ

تمہارا رشتہ قرابت کا رسولؐ اللہ کے ساتھ ان سے زیادہ ہے۔اور جس طرح کی دامادی تم کو حاصل ہے وہ انھیں حاصل نہ تھی۔ پس خدا سے ڈرو۔ خدا سے ڈرو۔ اپنے بارے میں بخدا تم اندھے پن سے آنکھیں نہیں کھولتے اور جہالت کے بدلے علم سے کام نہیں لیتے حالانکہ راستے روشن ہیں اور دینی تعلیمات بالکل ظاہر ہیں۔تم کو معلوم ہونا چاہئے کہ تمام بندگان خدا میں سب سے بہتر وہ عادل حاکم ہے جو ہدایت یافتہ ہو اور اس سے ہدایت حاصل کی جائے۔ وہ سنت کو قائم کرے اور بدعت کو فنا کرے۔اور خدا کی سنتیں بالکل روشن ہیں ان پر نشانیاں موجود ہیں اور بدعتیں بھی بالکل ظاہر ہیں ان پر بھی نشانیاں ہیں اور بدترین خلق وہ ظالم حاکم ہے جو خود بھی گمراہ ہو اور لوگ بھی اس کے ہاتھوں گمراہی میں مبتلا ہوں وہ اس سنت کو جو رسولؐ سے حاصل ہوئی ہے مردہ کرے اور ایسی بدعت کو جو اب تک جاری نہیں ہے قائم کرے اور میں نے رسولؐ اللہ سے سنا ہے کہ روز قیامت ظالم حاکم کو لایا جائے گا اس طرح کہ اس کا کوئی فریادرس اور مددگار نہ ہوگا وہ آتش جہنم میں ڈالا جائے گا تو اس میں چکر کھائے گا جس طرح چکی گھومتی ہے۔ پھر جہنم کی تہہ میں بیٹھ جائے گا۔

اس میں مخالف کی جانب سے ابتدائی فقرات اپنے مفید مطلب سمجھ کر نقل کئے گئے ہیں۔ چونکہ حکمت وموعظۂ حسنہ کے اصول پر ان کا طرز ادا خوش گوار تھا اور آخری فقرات جن میں نصیحت کے الفاظ میں رفتہ رفتہ تلخی اور تیزی پیدا ہوئی تھی اور جس کا خاتمہ آتش جہنم کے تذکرہ پر ہوا تھا انھیں اپنے مسلک اور مقصد کے خلاف چھوڑ کر ترک کیا گیا ہے۔

یہ ظاہر ہے کہ شرعی احکام کی ذمہ داریاں اسی وقت عائد ہوتی ہیں جب انسان کو ان کا علم بھی حاصل ہو۔ ناواقفیت میں جو امور انجام پاتے ہیں ان میں جرم بہت سبک ہوتا ہے اور اس لئے الزام میں کوئی وزن بھی نہیں ہوتا۔

عثمان جو کچھ کرتے تھے ''دیدہ و دانستہ'' کرتے تھے۔ اس کے اظہار کی تمہید ہے وہ جسے آج انتہائی فضیلت سمجھ کر ذکر کیا جارہا ہے۔

کون سی بات ہے جو تم کو معلوم نہیں۔ کیا رسولؐ اللہ کی سیرت کو ہم نے دیکھا ہے تم نے نہیں دیکھا؟ کیا مسلمانوں کے حقوق اور نیز اصول مساوات کے متعلق رسول کے تعلیمات کو ہم نے سنا ہے تم نے نہیں سنا۔ پھر آخر ان تعلیمات سے یہ چشم پوشی کیوں؟ ان ہدایات پر عمل کرنے میں یہ کوتاہی کس لئے؟

معلوم ہوتا ہے کہ اس علم اور اطلاع سے مراد ان باتوں پر اطلاع ہے جو موجودہ حالات میں حضرت عثمان پر اتمام حجت سے تعلق رکھتے ہیں اور یہی وہ چیز ہے جو محل وموقع سے وابستہ ہوسکتی ہے۔

اس کو دیگر تمام علوم وکمالات یا معرفت باری تعالیٰ یا مسائل فقہیہ کی واقفیت وغیرہ سے کیا تعلق؟ جس سے یہ نتیجہ نکالا جائے کہ حضرت عثمان بس بالکل جناب امیر کے مساوی تھے اور کوئی فرق نہ تھا۔

آخر اس تمام علم ومعرفت کے باوجود اس کے معنی پھر کیا ہوسکتے ہیں کہ إِنَّكَ مَا تَبَصَّرَ مِنْ عَمًى وَلَا تُعَلَّمُ مِنْ جَهْلٍ۔ تم اندھے ہورہے ہو اور آنکھیں نہیں کھولتے جہالت میں مبتلا ہو اور علم سے کام نہیں لیتے۔''

صحبت رسولؐ کے حصول سے صرف یہ مقصود ہے کہ اس درجہ تک جس کی تمہیں اپنے عمل میں لاج رکھنا چاہئے۔تم کو یہ شرف بھی حاصل ہے۔ نہ یہ کی وقت زمانہ اور مقدار کے اعتبار سے وہ صحبت بالکل اس صحبت کے برابر ہی ہے۔ جو امیرالمومنینؑ اور آپ کے بعد دوسرے سابقین اسلام کو حاصل تھی۔ یہ تو واقعہ کے بالکل خلاف ہے۔ یہ معنی کیسے قرار دیئے جاسکتے ہیں۔

ان تمام باتوں سے تو امیرالمومنینؑ الزام اور جرم کو سنگین بنا رہے ہیں۔اسی لئے اس کلام کے آخر میں آپ نے فرمایا ہے۔

فَلَا تَكُونَنَّ لِمَرْوَانَ سَيِّقَةً يَسُوقُكَ حَيْثُ شَاءَ بَعْدَ جَلَالِ السِّنِّ وَتَقَضِّي الْعُمُرِ۔

''مروان کے ہاتھ میں بالکل بھیڑ بکری کی طرح نہ بنو کہ

جدھر چاہے وہ تمہیں لے جائے جبکہ تم سن رسیدہ ہو گئے ہو اور عمر گذر گئی ہے۔''

''دامادی'' کی لفظ پر بڑا زور دیا جاتا ہے حالانکہ جو شیعی علماء اس امر کے منکر ہیں کہ رسول اللہ کی صلبی بیٹیاں حضرت عثمان کو منسوب تھیں۔ وہ بھی کہتے ہیں کہ وہ حضرت کی ربیبہ تھیں یعنی جناب خدیجہ کے ساتھ آئی تھیں اور حضرت کی پرورش میں رہی تھیں اس لئے آپ کی بیٹیاں کہلاتی تھیں پھر جس طرح کی وہ رسول کی بیٹیاں تھیں اسی طرح کے حضرت عثمان داماد بھی سمجھے جاسکتے تھے۔ مگر حضرات شیخین کو اس طرح کی بھی بات حاصل نہ تھی۔ اسی لئے اس امر پر آپ نے موازنہ عثمان اور حضرت ابوبکر وعمر میں فرمایا ہے۔ یہاں آپ اپنی ذات کو بالکل معرض بحث میں نہیں لائے ہیں۔ اس لئے کہ آپ اپنی دامادی کی شان میں متفرّد تھے۔

پھر اس پر اتنا زور دینے سے حاصل کیا ہے جبکہ وہ کوئی مذہبی مسئلہ نہیں ہے بلکہ ایک تاریخی بحث ہے۔

اگر وہ دونوں رسول اللہ کی صلبی بیٹیاں بھی فرض کرلی جائیں تو کیا نتیجہ نکل سکتا ہے جبکہ وہ جناب عثمان سے پہلے دو صریحی کافروں کو منسوب ہوچکی تھیں۔ رہ گیا اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ جناب عثمان کامل الایمان تھے۔ اس میں کوئی کامیابی حاصل ہونا مشکل ہے اس لئے کہ عقد نکاح کی صحت میں شرعاً ظاہری اسلام کافی ہے۔

سب سے زیادہ اس کلام میں قابل لحاظ وہ جزو ہے جس میں ظالم حاکم کی پاداش ذکر کی گئی ہے اور عثمان کو متنبہ کیا گیا ہے۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ آپ مخاطب کے طرز عمل کو ظالمانہ قرار دے رہے ہیں۔ نیز ظالم کے لئے اس وعید کا حوالہ دیتے ہیں کہ وہ جہنم میں جائے گا۔

اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس وعید سے کوئی جماعت مستثنیٰ نہیں ہے اور نہ کسی فرد کو اس سے علٰحدگی کا پروانہ ملا ہے ورنہ حضرت عثمان کے مقابلہ میں اس وعید کو ذکر کرنے کا کوئی حاصل نہ تھا اور کم از کم حضرت عثمان ہی جواب میں اپنے اس پروانۂ نجات کا ذکر کر دیتے۔ پھر اگر حضرت عثمان اس کے بعد اپنے سابقہ طرز عمل سے علٰحدہ نظر آئیں تب تو ٹھیک ہے ورنہ حضرت علیؑ کے عقیدہ اور قول کے مطابق وہ پیغام جو آپ نے رسولؐ کی زبانی نقل کیا ہے حضرت عثمان کے لئے خوش اعتقادی کی دنیا کو بالکل ویران کر دیتا ہے۔

لطف یہ ہے کہ اس تقریر کے جواب میں جناب عثمان نے بہت عاجزی کے ساتھ اپنے مظالم کا اقرار کیا اور کہا کہ ''آپ ان لوگوں سے کچھ مہلت حاصل کر لیجئے تو میں ان کے مظالم کا تدارک کر دوں گا۔''

مگر یہ تاریخ سے ظاہر ہے کہ حضرت عثمان نے اس وعدہ کو پورا نہیں کیا اور آپ آخر تک اپنے طرز عمل پر قائم رہے۔ اس کے بعد دنیا کو اختیار ہے کہ وہ جناب امیرؑ کے مذکورہ بیانات کے ماتحت جن پر حضرت عثمان کے اعتراف کی مہر بھی ہوچکی ہے جو رائے چاہے قائم کرے۔

معاویہ اور اہل شام کی نسبت آپ کے آراء واقوال

(۱) نہج البلاغہ جلد ا صفحہ ۲۱۱

أَنْظُرُ إِلَى ضِلِّيلٍ قَدْ نَعَقَ بِالشَّامِ وَفَحَصَ بِرَايَاتِهِ فِي ضَوَاحِي كُوفَانَ.

''میں ایک انتہائی گمراہ شخص کو دیکھ رہا ہوں کہ اس نے شام میں آواز بلند کی ہے اور کوفہ کے بیرونی اطراف میں اپنے جھنڈوں کو گاڑ دیا ہے۔''

اس میں آپ نے امیر شام کو ایک انتہائی گمراہ شخص کی لفظ سے یاد کیا ہے۔

(۲) جلد دوم، ص ۷-۸ میں آپ نے خود معاویہ کو ان کے خط کے جواب میں لکھا ہے۔

نَمَّقْتَهَا بِضَلَالِكَ وَأَمْضَيْتَهَا بِسُوْءِ رَأْيِكَ وَكِتَابُ امْرِئٍ لَيْسَ لَهُ بَصَرٌ يَهْدِيْهِ وَلَا قَائِدٌ يُرْشِدُهُ قَدْ دَعَاهُ الْهَوَىٰ فَأَجَابَهُ وَقَادَهُ الضَّلَالُ فَاتَّبَعَهُ.

تو نے اس خط کو اپنی گمراہی سے لکھا ہے اور اپنی غلطی سے روانہ کیا ہے وہ ایک ایسے شخص کا خط ہے جس کے قوت بینائی موجود ہی نہیں کہ وہ اس کی ہدایت کرے اور نہ کوئی رہنما موجود ہے جو اسے راستہ بتلائے صرف خواہش نفس کی دعوت پر وہ آمادہ ہوا ہے اور گمراہی نے اس کو کھینچا ہے جس پر وہ چل کھڑا ہوا ہے۔''

(۳) جلد ۲ ص ۲۴ میں ہے۔

اِنِّیْ مِنْ ضَلَالِھِمُ الَّذِیْ ھُمْ فِیْہِ وَالْھُدَیٰ الَّذِیْ اَنَا عَلَیْہِ لَعَلٰی بَصِیْرَۃٍ مِنْ نَفْسِیْ وَیَقِیْنٍ مِنْ رَبِّیْ۔

''میں ان لوگوں کی اس گمراہی سے جس میں وہ مبتلا ہیں اور اس ہدایت سے جس پر میں قائم ہوں پورے طور پر مطمئن ہوں اور اپنے خدا کی جانب سے یقین کے درجہ پر فائز ہوں۔''

(۴) جلد اول ص ۱۰۹ میں آپ نے فرمایا ہے۔

اَلَا وَاِنَّ مُعَاوِیَۃَ قَادَلُمَۃً مِنَ الْغُوَاۃِ وَعَمَّسَ عَلَیْھِمُ الْخَبَرَ حَتّٰی جَعَلُوْا نُحُوْرَھُمْ اَغْرَاضَ الْمَنِیَّۃِ۔

''آگاہ ہو کہ معاویہ نے گمراہ لوگوں کی ایک جماعت کو کھینچ کر میدان جنگ میں بلایا ہے اور حقیقت حال کو ان پر مخفی رکھا ہے یہاں تک کہ انھوں نے اپنے سینوں کو موت کا نشانہ بنایا ہے۔ (۵)، ص ۱۱۷

لَاتُقْتِلُوا الْخَوَارِجَ بَعْدِیْ فَلَیْسَ مَنْ طَلَبَ الْحَقَّ فَاَخْطَأَہٗ کَمَنْ طَلَبَ الْبَاطِلَ فَاَدْرَکَہٗ (یعنی معاویہ واصحابہ)

خوارج کے قتل کے میرے بعد درپے نہ ہونا کیونکہ وہ شخص جو حق کا طالب ہو لیکن غلطی کر جائے اس کے مثل نہیں ہے جو باطل کو طلب کرے اور اسے پا بھی جائے (اس سے مقصود آپ کا معاویہ اور اس کے ساتھی ہیں)۔

اس عبارت میں آپ نے ان لوگوں کو خوارج سے بدتر بتلایا ہے چنانچہ شیخ محمد عبدہ نے اس کی شرح میں لکھا ہے۔

فالخوارج علی بابھم احسن حالا منھم۔

''خوارج اپنی گمراہی کے باوجود ان سے بہتر حالت رکھتے ہیں۔

(۶) جلد ۲ صفحہ ۱۷

مَا اَسْلَمُوا وَلٰکِنِ اسْتَسْلَمُوْا وَاَسَرُّوا الْکُفْرَ فَلَمَّا وَجَدُوْا اَعْوَاناً عَلَیْہِ اَظْھَرُوْہُ۔

''یہ لوگ اسلام نہیں لائے بلکہ ظاہری طور پر تابع اسلام ہو گئے تھے اور کفر کو پوشیدہ کر لیا تھا اب جبکہ ان کو مددگار مل گئے اپنے مقاصد کے حاصل کرنے کے تو اسی دشمنیٔ اسلام کے جذبے کو ظاہر کر دیا۔''

تعجب ہے کہ امیر المومنینؑ کے ان تصریحات کی موجودگی میں یہ کہا جاتا ہے کہ آپ معاویہ اور ان کے ساتھیوں کو مومن کامل سمجھتے تھے۔ اور اس کے ثبوت پیش کئے جاتے ہیں آپ کے الفاظ جو آپ نے گشتی فرمان کی صورت سے جنگ صفین کے بعد امراء ممالک کو لکھ کر بھیجے تھے اور جس میں جنگ صفین کی روئیداد سے انھیں مطلع کیا گیا تھا۔ جلد دوم صفحہ ۱۱۸

وَکَانَ بَدْءُ اَمْرِنَا اَنَّا اَلْتَقَیْنَا وَالْقَوْمُ مِنْ اَھْلِ الشَّامِ وَالظَّاھِرُ اَنَّ رَبَّنَا وَاحِدٌ وَنَبِیَّنَا وَاحِدٌ وَدَعْوَتَنَا فِی الْاِسْلَامِ وَاحِدَۃٌ وَلَا نَسْتَزِیْدُھُمْ فِی الْاِیْمَانِ بِاللہِ وَالتَّصْدِیْقِ بِرَسُوْلِہٖ وَلَا یَسْتَزِیْدُوْنَنَا الْاَمْرُ وَاحِدٌ اِلَّا مَا اخْتَلَفْنَا فِیْہِ مِنْ دَمِ عُثْمَانَ وَنَحْنُ مِنْہُ بَرَاءٌ۔

''ابتدائی حالات یہ ہیں کہ ہم سے اور شام والوں کی ایک جماعت سے مقابلہ ہوا اس صورت میں کہ ظاہری طور پر ہمارا خدا ایک تھا۔ ہمارا نبی ایک تھا۔ اور اسلام میں ہماری آواز ایک تھی اور خدا اور رسولؐ پر ایمان کے بارے میں نہ ہم ان سے زیادتی کے طالب تھے اور نہ وہ ہم سے۔ سب باتوں میں اتفاق تھا مگر بس وہ جو ہمارے درمیان عثمان کے خون میں اختلاف ہو گیا تھا اور واقعہ یہ تھا کہ ہم اس سے بالکل بری تھے۔''

اس میں ''ظاہر'' کی لفظ سے بالکل ظاہر ہے کہ یہ اتحاد ایمان باللہ اور تصدیق رسول وغیرہ صرف ظاہری حیثیت سے تھا۔ باطن اس کے سوا کچھ اور تھا اور یہی وہ ہے جس کی تفصیل اس کے پہلے

والے کلام میں موجود ہے۔ پھر آخر اس کو ان لوگوں کے واقعی ایمان سے کیا واسطہ؟

عصمت

کہا جاتا ہے کہ امیرالمومنینؑ نے نہج البلاغہ میں اپنے معصوم ہونے کی نفی کی ہے۔ اس کے لئے نہج البلاغہ جلد ا صفحہ ۴۶۳ سے جس عبارت کا اقتباس پیش کیا جاتا ہے وہ یہ ہے۔

فَاِنِّیْ لَسْتُ فِیْ نَفْسِیْ بِفَوْقِ اَنْ اُخْطِیَٔ وَلَا اٰمَنُ ذٰلِكَ مِنْ فَعْلِیْ اِلَّا اَنْ یَّكْفِیَ اللّٰهُ فِیْ نَفْسِیْ مَا هُوَ اَمْلَكُ بِهٖ مِنِّیْ۔

''میں اپنے نفس کے لحاظ سے اس سے بالاتر نہیں ہوں کہ غلطی کروں اور نہ مجھے اپنے فعل سے اس کا اطمینان ہوسکتا ہے۔ مگر یہ کہ خدا میرے نفسانی تقاضے کو میرے قابو میں رکھے جس پر وہ مجھ سے زیادہ قادر ہے۔''

اس کے آخری فقرہ کو نظرانداز کر کے پہلے ٹکڑے سے مطلب نکالا جاتا ہے یہ ظاہر ہے کہ نفسانی خواہشیں ایک معصوم میں بھی پائی جاتی ہیں مگر جبکہ ''عصمت'' ایک خداوندی لطف ہے تو آخری جزو میں جو استثنا کیا گیا ہے وہی عصمت کی طرف اشارہ کا حامل ہوسکتا ہے۔ جو لوگ اس سے امیرالمومنینؑ کی عصمت کے خلاف استدلال پیش کرسکتے ہیں وہ حضرت یوسف کو یقینا عصمت کے حدود سے خارج سمجھ چکے ہیں ان کے ان الفاظ سے جو قرآن میں درج ہیں کہ مَاۤ اُبَرِّئُ نَفْسِیْ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌ بِالسُّوْٓءِ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّیْ۔ میں اپنے نفس کو بری نہیں کرتا کیونکہ نفس تو برائیوں کی تحریک کرتا ہی ہے مگر یہ خدا کا رحم شامل حال ہو۔''

حضرت یوسفؑ کے الفاظ حضرت علیؑ بن ابی طالبؑ کی لفظوں سے زیادہ نفس کے مجرمانہ تقاضے کا اظہار کرتے ہیں مگر وہاں (اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّیْ) کے الفاظ میں جو استثنا ہے وہ ہی امیرالمنینؑ کے کلام میں (الّا ان یکفی اللہ الخ) کے الفاظ میں موجود ہے۔ نبی اور امام کا لب ولہجہ اس مقام پر بالکل متحد ہے۔ اور اس میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اور رسولؐ اللہ کے یہ الفاظ بھی قرآن میں موجود ہیں۔ ما انا بشر مثلکم یوحی الی پہلے ٹکڑے سے لوگ یہی سمجھیں گے کہ آپ کو کوئی امتیاز عام افراد انسانی سے ہے ہی نہیں مگر یوحی الی سے اس خصوصیت کی طرف اشارہ ہے جو آپ کو خدا کی جانب سے حاصل ہے۔

امیرالمومنینؑ کا درجہ اور خصوصیت کس حد پر تھی اس کو ملاحظہ کیجئے اس خطبہ میں۔ جلد اول، ص ۴۱۶

قَدْ عَلِمْتُمْ مَوْضِعِیْ مِنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَاٰلِهٖ بِالْقَرَابَةِ الْقَرِيْبَةِ وَالْمَنْزِلَةِ الْخَصِيْصَةِ وَضَعَنِیْ فِیْ حِجْرِهٖ وَاَنَا وَلَدٌ يَضُمُّنِیْ اِلٰى صَدْرِهٖ وَيَكْنُفُنِیْ فِیْ فِرَاشِهٖ وَيُمِسُّنِیْ جَسَدَهٗ وَيُشِمُّنِیْ عَرْفَهٗ وَكَانَ يَمْضَغُ الشَّیْءَ ثُمَّ يُلْقِمُنِيْهِ وَمَا وَجَدَ لِیْ كَذْبَةً فِیْ قَوْلٍ وَلَا خَطْلَةً فِیْ فِعْلٍ۔

''تم کو معلوم ہے میرا درجہ جو رسولؐ اللہ کے ساتھ قریبی قرابت اور مخصوص مرتبہ کی حیثیت سے حاصل ہے۔ آپ نے مجھ کو اپنی تربیت میں لیا اس وقت جب میں بچہ تھا، آپ مجھ کو اپنے سینہ سے لگاتے تھے اور بچھونے پر اپنے پہلو میں سلاتے تھے اور مجھ سے اپنے جسد کو متصل کرتے تھے اور اپنی خوشبو مجھے سنگھاتے تھے اور غذا چبا کر میرے منہ میں دیتے تھے اور آپ نے نہ میرے اقوال میں کبھی کوئی غلط بیانی دیکھی اور نہ افعال میں کوئی لغزش۔''

یہ ہے عصمت کا اظہار جس کے قول وفعل میں رسول کو خطا اور غلطی نظر نہ آئے وہ معصوم نہیں تو کیا ہے؟ (ص ۴۱۷)

وَلَقَدْ سَمِعْتُ رَنَّةَ الشَّيْطَانِ حِيْنَ نَزَلَ الْوَحْیُ عَلَيْهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَاٰلِهٖ فَقُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ مَا هٰذِهِ الرَّنَّةُ فَقَالَ هٰذَا الشَّيْطَانُ قَدْ اَيِسَ مِنْ عِبَادَتِهٖ اِنَّكَ تَسْمَعُ مَاۤ اَسْمَعُ وَتَرٰی مَاۤ اَرٰی اِلَّاۤ اَنَّكَ لَسْتَ بِنَبِیٍّ وَلٰكِنَّكَ وَزِيْرٌ۔

''میں نے شیطان کی فریاد سنی اس وقت جب حضرت پر وحی نازل ہوئی تو میں نے کہا یا رسول اللہ یہ فریاد کیسی ہے۔ آپ نے فرمایا یہ شیطان ہے جو آج اپنی پرستش سے مایوس ہوگیا۔ تم تو

سنتے ہو وہ جو میں سنتا ہوں اور دیکھتے ہو وہ جو میں دیکھتا ہوں۔مگر تم نبی نہیں ہو۔ بے شک وزیر ہو۔''

حضرت علیؑ بن ابی طالب کے مرتبہ سے ناشناس افراد یقینا اس کو غلو سمجھیں گے مگر وہ ایک حقیقت ہے جسے امیرالمومنینؑ نے رسولؐ اللہ کی زبانی بیان کیا ہے۔

یہ امیرالمومنین علیؑ بن ابی طالبؑ کے اقوال وتعلیمات تمام مسلمانوں کی واقفیت کے لئے پیش ہیں ۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر ان اقوال پر غور کیا جائے تو مسلمانوں میں افتراق کی خلیجیں بہت کم ہوجائیں اور کم از کم وہ منافرت جو باہمی پائی جاتی ہے دور ہوجائے ۔ کیونکہ یہ اس ہستی کے تعلیمات ہیں جو تمام مسلمانوں میں نقطۂ مشترک کی حیثیت رکھتی ہے اور جسے کسی نہ کسی درجہ پر تمام مسلمان امام خلق اور پیشوائے مطلق تسلیم کرتے ہیں۔

والسلام

علی نقی النقوی عفی عنہ

۱۰ر ربیع الثانی ۱۳۵۷ھ

❀❀❀

(بقیہ صفحہ ۲۶ کا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔)

میں تبدیل ہورہی ہے، جس کے اثرات زبان وبیان، روزمرہ محاورات وغیرہ پر بھی مرتب ہورہے ہیں، لہٰذا ترمیمات کے شعبہ ہائے زباندانی وغیرہ بھی اچھوتے نہیں رہ سکتے، مگر دہلی کی زباندانی بری طرح متاثر ہوتی معلوم ہوتی ہے۔ پاکستان کے ایک معروف ادیب وشاعر جو دہلی زباندانی کے علمبردار سمجھے جاتے ہیں، عجیب اردو لکھتے ہیں۔مثلاً ترجمہ گیتا میں ارجن کی بابت کہا ہے:

کھڑے سے ہوگیا بیٹھا

کیا اردو ہے! مولانا موصوف پر ایسی گرفت نہیں کی جاسکتی، اچھے شاعر اور بڑے ادیب ہیں ۔ استاذی اثرؔ لکھنوی، صفیؔ لکھنوی، سرتیج بہادر سپرد، مسعود حسن رضوی ایسے پائے کے ادیبوں نے مولانا موصوف کے کام ونام کو سراہا ہے ۔ ان مکتوبات پر مشتمل ایک تصنیف بھی شائع کی جانا چاہیئے۔

(بقیہ صفحہ ۵۵ کا۔۔۔۔۔۔۔۔۔)

(۱۰۰)

زینبؑ یہ سن کے خیمے سے نکلیں برہنہ پا
مقتل کی سمت دوڑ پڑیں دے کے یہ صدا
بھیا، میں آرہی ہوں، توقف کریں ذرا
عباسؑ سا وہ بھائی نہیں ہے تو کیا ہوا
میں رن سے اپنے لال کو خیمے میں لاؤں گی
ساتھ آپ کے جوان کی میت اٹھاؤں گی

(۱۰۱)

دیکھا بہن کو رن میں جو بے مقنع و ردا
شبیرؑ نے لرز کے کہا، کیا غضب کیا
زینبؑ، یہ کیا، ابھی تو ہے زندہ یہ بے نوا
ہم کو ابھی سے شام کا منظر دکھا دیا
خیمے میں جاؤ، بنتِ پیمبرؐ کا واسطہ
زینبؑ، تمہیں جوانئ اکبرؑ کا واسطہ

(۱۰۲)

پلٹی جو رن سے خیمے کو زہراؑ کی نورِ عین
لاشِ پسر اٹھا کے چلے شاہؑ مشرقین
عباسؑ ہیں نہ قاسمؑ و سعد و زہیر قین
فریاد از غریبی و بے یاری حسینؑ
اٹھو، چلیں کہ ہم ابھی زندہ ہیں، دوستو
مولاؑ جواں کی لاش پہ تنہا ہیں، دوستو

(۱۰۳)

ساحرؔ! بس اب خموش کہ ہے جوش پر بکا
پہلا یہ مرثیہ مرے مولاؑ کی ہے عطا
دستِ طلب بڑھا کے سوئے شاہؑ کربلا
کیجئے زبانِ فاخرؔ مغفور میں دعا
مطلب یہی ہے آپ سے بس اس حقیر کا
یا شاہ دیں! قبول ہو ہدیہ فقیر کا

ماخوذ از کتاب مجموعہ مراثی احساسِ غم، مصنفہ ساحرؔ اجتہادی

نوٹ: مرثیہ میں جن شعراء کے اسماء گرامی مذکور ہیں ان کے بالاختصار تذکرے آئندہ شمارہ میں قارئین ملاحظہ فرمائیں گے۔

(ادارہ)